ڈاکٹر عرفان شہزاد

قانونِ اتمامِ حجت اور اس کے اطلاقات

نمایاں اعتراضات کا جائزہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

دین میں جبر کی نفی اور اتمام حجت کے بعد کی سزا

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین تسلیم کرانے میں جبر روا نہیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام حجت کے بعد آپ کے منکرین پر قتل و محکومی کی سزا کا نفاذ کیا جبر نہیں ہے؟

معاملہ دراصل یوں ہے کہ دنیا میں لوگ خدا کی طرف سے اس حق کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں کہ وہ اپنے خالق کو پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت کریں، ان کی پیدایش کا مقصد ہی یہ بتایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. ''میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اِس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔'' (الذاریات ۵۱: ۵۶)

انسان جب خدا شناسی اور خداے واحد کی عبادت کے اپنے اس مقصد پیدایش سے غافل ہو جاتا ہے تو خدا کی رحمت اسے اس طرف متوجہ کرنے کے لیے اس کی عقل و فطرت کی گواہی اور وحی کے ذریعے سے بھی یاد دہانی کراتی ہے۔ اب اگر کوئی آخری درجے میں اتمام حجت کے بعد بھی انکار پر قائم رہتا ہے، باوجود اس کے کہ اس کے پاس

انکار کا کوئی عذر بھی نہ رہتا تو وہ اپنا مقصد پیدایش کھو دیتا ہے، چنانچہ اپنا زندہ رہنے کا حق بھی کھو دیتا ہے۔ ایسے افراد کے لیے خدا کی طرف سے ان کی موت کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ جبر نہیں، بلکہ ان کے حق زندگی کے خاتمے کا اعلان ہے۔ یہ معلوم ہے کہ یہ اتمام حجت اس دنیا میں رسولوں کے ذریعے سے ہی ممکن تھا۔ رسول کے براہ راست مخاطبین کے علاوہ جو لوگ ہیں، ان پر ان کی عقل و فطرت اور وحی کے ذریعے سے بھی حجت کسی نہ کسی درجے میں قائم ہوتی رہتی ہے، لیکن ان پر آخری درجے میں حجت کا تمام ہونا بہت مشکل ہے اور اگر ہو بھی جائے تو اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں، کیونکہ یہ انسانی ضمیر کا معاملہ ہے اور اس کی اطلاع ایک رسول کو بھی نہیں ہوتی، خدا ہی اسے مطلع کرتا ہے۔ چنانچہ اجتماعی سطح پر ایسے افراد و اقوام جن پر رسول نے اتمام حجت نہیں کیا، ان کا انکار بھی بلا عذر ہے، اس کا فیصلہ کرنا اب ممکن نہیں۔ اس لیے اجتماعی سطح پر ان پر سزا کا نفاذ بھی اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا فیصلہ آخرت میں کیا جائے گا۔ لیکن جن پر اتمام حجت رسولوں کے ذریعے سے ہوا اور انھوں نے بلا عذر انکار پر اصرار کیا، ان کی موت کا فیصلہ خدا کی طرف سے اس دنیا میں ہی کر دیا گیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موت کا یہ فیصلہ دو صورتوں میں آیا: قدرتی آفات کے ذریعے سے اور رسول کے ساتھیوں کی تلواروں کے ذریعے سے۔ جب یہ فیصلہ قدرتی طاقتوں کے ذریعے سے ناگہانی آفات کی صورت میں لاگو کیا گیا تو جبر کا سوال پیدا نہیں ہوا، کیونکہ خدائی فعل صاف دکھائی دے رہا تھا، لیکن جب یہی فیصلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تلوار کے ذریعے سے نافذ ہوا تو محل اشکال بن گیا کہ کچھ انسان دوسرے انسانوں کو اپنی مرضی سے اپنے عقیدے پر جینے کی اجازت کیوں نہیں دے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی واضح نصوص کے مطابق خدا نے صحابہ کے ہاتھوں سے یہ عذاب ان پر نازل کیا تھا۔ اس واقعے کی ظاہری صورت سے ہٹ کر معاملے کی درست نوعیت اگر ذہن میں رہے تو جبر سے متعلق مذکورہ سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ اصول یہ ہے کہ منکرین حق کو اتمام حجت کے بعد مرنا پڑا، کیونکہ وہ اپنی پیدایش کا مقصد ہی فوت کر بیٹھے تھے۔ خدا کی طرف سے آنے والے عذاب کی ان دونوں صورتوں میں ایک ہی اصول کارفرما ہے۔

کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتمام حجت صرف جزیرۂ عرب تک محدود تھا؟

ایک سوال یہ ہے کہ ''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمامِ حجت کا مشن صرف جزیرۂ عرب تک محدود تھا؟ کیونکہ آپ کو زندگی میں غلبہ صرف جزیرۂ عرب کی حد تک ہی ملا۔ یہ غلبہ بھی عارضی تھا اور آپ کی وفات کے ساتھ ہی

عرب میں ارتداد کی لہر پھیل گئی جس پر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی قابو پا سکے تھے اور مولانا اصلاحی کی اختیار کردہ تاویل کے مطابق سورۂ توبہ کی آیت 'فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان 'أمرت أن أقاتل الناس' کا عملاً نفاذ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ارتداد کی جنگ کے موقع پر ہی کیا۔ تو جب جزیرۂ عرب میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلبہ آپ کے بعد ہی مستحکم ہوا تو وہ اتمامِ حجت کے بعد رسول کے غلبے کی بات کیا ہوئی؟''

قرآن مجید کی یہ آیت اس پر شاہد ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت خصوصیت سے بنی اسمٰعیل کے لیے تھی، اور پھر بنی اسمٰعیل کی بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی نسبت سے باقی دنیا کے لیے ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (البقرہ ۲: ۱۴۳)

''(ہم نے یہی کیا ہے) اور (جس طرح مسجد حرام کو تمھارا قبلہ ٹھیرایا ہے)، اِسی طرح ہم نے تمھیں بھی ایک درمیان کی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم دنیا کے سب لوگوں پر (حق کی) شہادت دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تم پر یہ شہادت دے۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول کے ذریعے سے کسی خطے کے ایک خاص مرکزی شہر میں ایک نشانِ حق قائم کرنا مقصود ہوتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا. (القصص ۲۸: ۵۹)

''حقیقت یہ ہے کہ تیرا پروردگار اِن بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہیں تھا، جب تک اِن کے مرکز میں کسی رسول کو نہ بھیج لے جو ہماری آیتیں اِنھیں پڑھ کر سنا دے۔''

یہ نشان حق رسول کے مخالفین کی مغلوبیت کا نام ہے۔ خطے کے ہر ہر شہر اور بستی میں اسے دہرایا نہیں جاتا۔ موسیٰ علیہ السلام کی سرگذشت میں بھی یہ اصول دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ نشانِ حق مصر کے دارالحکومت میں قائم ہوا تھا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ام القریٰ مکہ اور قریب کے مرکزی علاقے تھے جہاں یہ نشان حق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین کی مغلوبیت اور آپ کے غلبے کی صورت میں ظاہر ہوا۔ خدا کا وعدہ پورا ہو گیا کہ اس کے رسول ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ یہ ملحوظ رہنا چاہیے کہ رسول کے غلبے سے محض سیاسی غلبہ مراد نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے

مفصل بحث گزر چکی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت، البتہ خدا کی یہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سیاسی غلبے کی صورت میں سامنے آئی۔ رسول کا غلبہ منکرین کی مغلوبیت کا نام ہے، جس کا اظہار منکرین پر دنیوی عذاب کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس عذاب کو مکمل طور پر برپا ہوتے ہوئے دیکھنا بھی رسول کے لیے ضروری نہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں بتایا گیا تھا کہ آپ اس دنیوی عذاب کے نازل ہونے سے پہلے دنیا سے رخصت بھی ہو سکتے تھے۔ تاہم، آپ نے اپنے منکرین کی مغلوبیت اپنی زندگی میں ہی دیکھ لی اور رسولوں سے متعلق خدا کی سنت کا ظہور ہو گیا۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ ذریت ابراہیم، یعنی اس کی دوسری شاخ بنی اسمٰعیل کے غلبے کی داستان ہے۔ سیاسی غلبے کا وعدہ اصلاً ذریت ابراہیم سے ہے۔ بنی اسمٰعیل کے غلبے کا آغاز بھی البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرا دیا گیا، کیونکہ آپ ہی اس وقت بنی اسمٰعیل کے سربراہ بھی تھے۔

رہی یہ بات کہ آپ کی وفات کے فوراً بعد جزیرۂ عرب میں ارتداد پھیل گیا اور آپ کا غلبہ ختم ہو گیا تو جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا کہ رسول کے لیے سیاسی غلبہ قائم ہونا ضروری نہیں۔ دوسرے یہ کہ رسول کے بعد حالات کی تبدیلی سے یہ حقیقت نہیں بدل جاتی کہ رسول کے ذریعے سے حق کا غلبہ قائم ہوا تھا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے قائم ہونے والا نشان حق بنی اسرائیل کی گمراہیوں کے باوجود آج بھی اپنی جگہ قائم اور نمونۂ عبرت ہے، اسی طرح قرآن مجید، تاریخ اور سیرت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلبۂ حق کی سرگذشت محفوظ ہو کر قیامت تک کے لیے ایک نمونۂ عبرت کے طور پر قائم ہے۔

ذریت ابراہیم کے رسولوں کے ساتھ معاملہ یوں ہوا کہ نشان حق قائم ہو جانے کے بعد، باقی کا سیاسی غلبہ ذریت ابراہیم کرتی تھی، جیسا کہ ان سے خدا کا وعدہ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے خلفا نے باقی کا غلبہ پورا کیا تھا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفا کے ہاتھوں عرب اور بیرون عرب غلبے کا وعدہ پورا ہوا۔

اتمام حجت تو ممکنہ حد تک انفرادی طور پر ہوا، لیکن اس کی سزا کا نفاذ اجتماعی طور پر ہوا

یہ بات مدنظر رہنی چاہیے کہ خدا کی طرف سے اقوام کے بارے میں فیصلے ان کے انفرادی رویوں کی بنیاد پر نہیں، بلکہ اجتماعی رویوں کے لحاظ سے کیے جاتے ہیں۔ مثلاً خدا فرماتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ. (ہود ۱۱: ۱۱۷)

''(اے پیغمبر)، تیرا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو (اُن کے) کسی ظلم کی پاداش میں ہلاک کر دے،

جب کہ اُن کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔''

یہ معلوم ہے کہ کسی صالح ترین معاشرے میں بھی سارے کے سارے ہی مصلح اور نیک نہیں ہوتے۔ اس آیت سے مراد ایسا سماج ہے جہاں افراد کی ایک قابل لحاظ تعداد اصلاح میں مصروف ہو، جن کے اثرات اجتماعی طور پر ظاہر ہو رہے ہوں تو اس سماج کے دیگر افراد کے مظالم کے باوجود خدا انھیں تباہ نہیں کرتا۔ لیکن اصلاح کرنے والے اگر اس قابل نہ ہو پائیں کہ اجتماعی دھارے کو متاثر کر سکیں تو پھر چاہے وہ مصلح نبی اور رسول ہی کیوں نہ ہوں، خدا اس قوم کی اجتماعی نالائقی کی بنا پر ان کو بالآخر تباہ کر دیتا ہے۔ اسی قانون کو قرآن مجید میں ایک اور طرح سے یوں بیان کیا گیا ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ. (الانفال ۸: ۵۳)

''یہ اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اُس نے کسی قوم کو عطا کی ہو، اُس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ اپنے آپ میں تبدیلی نہ کریں۔ (نیز) اِس وجہ سے کہ اللہ سمیع و علیم ہے۔''

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

یہ بھی کبھی ممکن نہیں ہوا کہ کسی بدترین معاشرے میں سب کے سب ہی گناہ گار ہوں۔ کوئی بھی سماج کتنا ہی برا کیوں نہ ہو، اس میں کچھ اچھے اور کچھ بہت اچھے لوگ بھی ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن مجموعی حالت اگر ناقابل اصلاح ہو جائے تو چند نیک صفت لوگوں کی وجہ سے خدا اس قوم کی خرابی کا فیصلہ بدلتا نہیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال یہود ہیں۔ یہود پر بہ حیثیت قوم لعنت کی گئی تھی، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بھی تسلیم تھا کہ ان میں کچھ بہت اعلیٰ صفات کے حامل لوگ بھی موجود تھے جن کی تعریف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ لیکن ان پر لعنت کا فیصلہ ان کی مجموعی حالت کے پیش نظر کیا گیا تھا۔

اسی کلیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رسولوں کے ذریعے سے اتمام حجت تو ممکنہ حد تک انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطح پر ہوا، لیکن رسول کے انکار کے بعد دنیوی سزا کے نفاذ کا فیصلہ قوم کے مجموعی رویے کی بنا پر ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے افراد کی موجودگی کا امکان تھا کہ ان کو مزید سمجھانے کی ضرورت ہو سکتی تھی، لیکن وہ بھی اس اجتماعی فیصلے کا شکار ہوئے۔ اب ایسے افراد کا معاملہ آخرت میں دیکھا جائے گا، اگر وہ رعایت کے مستحق ہوں گے تو خدا کی طرف سے رعایت مل جائے گی، مگر دنیا کی ناگزیر محدودیت میں اتنا ہی ممکن تھا۔

اتمام حجت کے بعد خدا کی طرف سے آنے والے دنیوی عذاب کی دونوں صورتوں میں یہی اصول کارفرما رہا کہ

منکرین کا فیصلہ ان کے اجتماعی رویے کی بنا پر کیا گیا۔ چنانچہ عذاب جب قدرتی طاقتوں ـــــ ہوا، پانی اور زلزلہ وغیرہ ـــــ کے ذریعے سے دیا گیا تو وہاں بھی اس بات کا پورا امکان ہے کہ ان منکرین کے ساتھ ان کے معصوم بچے، کم عقل اور فاتر العقل افراد بھی ضرور مارے گئے ہوں گے۔ ان میں شاید ایسے بھی ہوں جن کو مزید سمجھانے کی ضرورت ہو۔ عذاب سے پہلے جس طرح مومنین کو بچالے جایا گیا، اس طرح کفار کی قوم میں سے ایسے افراد کو بچانا ممکن نہ ہو سکا، کیونکہ وہ اپنی قوم سے علیحدہ نہ ہو سکے تھے۔ ان کے حق میں وہ عذاب محض موت کا سبب بنا، اور موت تو آنی ہی تھی، جب کہ اجتماعی لحاظ سے وہ منکرین کی قوم پر عذاب اور نشان حق بن گیا۔

محمد رسول اللہ کے وقت جب دنیوی عذاب، صحابہ کی تلواروں کی صورت میں ظاہر ہوا تو اس عذاب کی نوعیت کی وجہ سے معصوم بچوں، اور دوسرے غیر مکلّف افراد حتیٰ کہ منکرین کی خواتین تک کو بچالینا ممکن ہو گیا۔ چنانچہ خواتین کو قتل نہیں کیا گیا، اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت کے سماج کی خواتین اپنے مردوں اور خاندانوں کے تابع تھیں۔ ان کی الگ خود مختارانہ حیثیت نہیں تھی۔ ان کا انکار حق بھی اپنے خاندان کے تابع تھا، اور اسلام کے غلبہ پا جانے کے بعد، ان کے خاندانوں کے ممکنہ طور پر مٹ جانے یا اسلام قبول کر لینے (حقیقتاً قبول اسلام ہی ہوا) کے بعد خود ان کا ایمان قبول کر لینا واضح تھا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بہرحال، عذاب کی اس صورت میں بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی قوم کا ساتھ دینے والوں میں ایسے افراد کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا جن کو خدا کے اس آخری فیصلے کے بعد بھی مزید سمجھانے کی ضرورت رہ گئی ہو گی۔ خود قرآن میں ہی بیان ہوا ہے کہ عین اس وقت جب مشرکین کے خلاف آخری اعلان جنگ کر دیا گیا، اس وقت بھی یہ ہدایت دی گئی کہ:

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (التوبہ ۹:۶)

’’اور اگر (اس داروگیر کے موقع پر) اِن مشرکوں میں سے کوئی شخص تم سے امان چاہے (کہ وہ تمھاری دعوت سننا چاہتا ہے) تو اُس کو امان دے دو، یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اُس کو اُس کے مامن تک پہنچا دو۔ یہ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو (خدا کی باتوں کو) نہیں جانتے۔‘‘

تاہم، خدا کی طرف سے جنگ کا اعلان قوم کے اجتماعی رویے کے لحاظ سے کر دیا گیا۔ اب گیہوں کے ساتھ جو

گھن بھی پس گیا، اس کا فیصلہ آخرت کی عدالت میں پورے عدل سے کیا جائے گا۔

اسی کلیے کا اطلاق روم و ایران کی اقوام کے خلاف صحابہ کی جنگوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اپنی قومی حیثیت میں انھوں نے صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ اسلام کے پیغام پر کبھی لبیک کہنے والے نہیں۔ بہ حیثیت قوم ان پر یہ بھی عیاں ہو چکا تھا کہ عرب میں اسلام کے ظہور اور غلبہ کی ایسی تبدیلی ایک غیر معمولی واقعہ تھا جو ان کے لیے اتمام حجت کا سبب بن گیا۔ لیکن عام آدمیوں میں ہم ایسے لوگوں کے وجود کے امکان کو رد نہیں کر سکتے جو 'بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ' (یہ ایسے لوگ ہیں جو (خدا کی باتوں کو) نہیں جانتے) کے زمرے میں آتے ہیں۔ تاہم جنگ قومی سطح پر ہونی تھی، سو وہ ہو کر رہی۔ ان اقوام کے ایسے افراد کا معاملہ آخرت کی عدالت میں دیکھا جائے گا۔

روم و ایران پر اتمامِ حجت اور صحابہ کی جنگی مہمات

روم و ایران پر اتمام حجت کے حوالے سے ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ''کیا قیصر و کسریٰ اور دیگر اقوام پر بھی اتمامِ حجت کیا گیا؟ اگر ہاں تو کیسے؟ اور اگر نہیں تو پھر ان کے خلاف صحابۂ کرام کی جنگوں کو اتمامِ حجت کے ''قانون'' میں کیسے فٹ کیا جا سکتا ہے؟''

اس پر مکرر عرض ہے کہ اتمام حجت کے ذریعے سے قائم کیا جانے والا نشان حق کسی ایک مرکزی علاقے میں اپنے تمام مراحل کے ساتھ برپا کیا جاتا ہے۔ ہر قوم کے لیے ہر دفعہ نئے سرے سے اس کا اعادہ نہیں کیا جاتا۔ نہ صرف روم و ایران، بلکہ جزیرۂ عرب کے بھی تمام علاقوں پر اس طرح اتمام حجت نہیں کیا گیا، جیسا مکہ میں ہوا۔

اتمام حجت کے وقت، عرب کے دیگر قبائل اور بیرون عرب ہمسایہ اقوام کے لیے رسول کے ذریعے سے برپا ہونے والا یہ واقعہ آنکھوں دیکھی بات کی طرح تھا، جو ان کے لیے اتمام حجت کا سبب بنا۔ جیسے ہمارے وقت میں ہمارے لیے متحدہ ریاست ہاے امریکا کے شہر نیویارک میں سن دو ہزار ایک میں نو گیارہ کا سانحہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے، جس سے ہم براہ راست متاثر ہوئے۔ یہ دیگر تاریخی واقعات میں سے ایک تاریخی واقعہ بننے سے پہلے ہمارے لیے ہمارے دور کا واقعہ ہونے کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ بنی اسمٰعیل کا غلبہ جزیرۂ عرب میں جب ہوا تو اہل روم و ایران کے عمائدین اور عوام کے علم میں یہ بات آ گئی اور وہ اس سے اسی طرح متاثر ہوئے، جیسے اپنے وقت کے کسی غیر معمولی واقعہ سے متاثر ہوا جاتا ہے۔ ان کے حق میں یہی اتمام حجت تھا۔ جس طرح قریش کو قوم نوح، قوم صالح، قوم عاد، اور قوم لوط وغیرہ پر رسولوں کے اتمام حجت اور اس کے نتائج کی سرگذشت سنا کر اتمام حجت کیا گیا،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اسی طرح عرب کے مرکزی علاقوں میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے اتمام حجت اور اس کے نتائج کے ظہور کی سرگذشت اس وقت کی دیگر اقوام کے لیے اتمام حجت کا ذریعہ بنی۔

یہ معلوم ہے کہ روم و ایران کی خبریں عرب میں بھی زیر بحث رہتی تھیں، جیسا کہ سورۂ روم سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے قومی سطح پر ایسے واقعات کو معمول کے واقعے سمجھا نہیں جا سکتا اور نہ یہ سمجھنا درست ہے کہ اس وقت کی قومیں ایک دوسرے کے ہاں قومی سطح کی تبدیلیوں اور ان کے مضمرات سے بے خبر ہوا کرتی تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ جنگ سے پہلے عرب قبائل اور اہل روم و ایران کو قبولِ اسلام کی اجمالی دعوت دیتے تھے، کیونکہ تفصیلات ان کے مخاطبین کے علم میں تھیں۔ یعنی ایسا نہیں تھا کہ محض سرحد پر کھڑے کھڑے اسلام قبول کرنے کی واجبی سی دعوت دے دی جاتی تھی اور سمجھ لیا جاتا تھا کہ اتمام حجت کا فرض ادا ہو گیا۔ بادشاہوں کے نام آپ کے خطوط میں بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت بالکل اجمالی انداز میں ہوا کرتی تھی، مگر ان بادشاہان کے ردعمل سے صاف ظاہر ہے کہ وہ جانتے تھے کہ کن بنیادوں پر اور کن نتائج کے لحاظ سے ان سے قبولِ اسلام کا مطالبہ کیا گیا تھا، یعنی کہ انکار کی صورت میں ان کے ساتھ بھی وہی ہونا تھا جو جزیرۂ عرب میں برپا ہوا تھا۔ ان اجمالی دعوتوں کے پیچھے پوری تاریخ ہے، جس پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے غلط نتائج نکالے گئے۔ مولانا عمار خان ناصر اپنی کتاب ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''...رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان خطوط کو ہمارے اہل سیرت بالعموم 'دعوتی خطوط' کا عنوان دیتے ہیں، حالانکہ ان کے مضمون اور پیش و عقب کے حالات سے واضح ہے کہ ان میں مخاطبین کو محض سادہ طور پر اسلام کی دعوت نہیں بلکہ یہ وارننگ دی گئی تھی کہ ان کے لیے سلامتی اور بقا کا راستہ یہی ہے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں، بصورت دیگر انھیں اپنی حکومت و اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مثال کے طور پر قیصر روم کے نام خط میں آپ نے لکھا: 'اسلم تسلم'۔

نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

ان قوله "اسلم تسلم" فی نهاية من الاختصار وغاية من الاعجاز والبلاغة وجمع المعانی مع ما فيه من بديع التجنيس وشموله لسلامته من خزی الدنيا بالحرب والسبی والقتل واخذ الديار والاموال ومن عذاب الآخرة. (شرح مسلم، ص ۱۱۴۴)

''اسلم تسلم کا جملہ بے حد مختصر لیکن غایت درجہ بلاغت و اعجاز کا حامل اور متنوع معانی پر محیط ہے۔ اس میں 'تجنیس' کی صنعت بھی بہت عمدہ طریقے سے استعمال ہوئی ہے اور 'تسلم' کے لفظ میں جنگ، قید، قتل اور اموال و دیار کے چھین لیے جانے کی صورت میں دنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب، دونوں سے بچاؤ کا مفہوم شامل

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے۔‘‘‘(۶۸)

’’ان بادشاہان کے ردعمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان خطوط کو صرف دعوتی خط نہیں سمجھا تھا۔ کسریٰ نے تو نامۂ مبارک ہی چاک کر ڈالا تھا۔ حارث بن ابی شمر غسانی کو آپ نے لکھا تھا کہ ایک اللہ پر ایمان لے آؤ تمھاری بادشاہت برقرار رہے گی۔ جواب میں اس نے کہا کہ مجھ سے میری بادشاہت کون چھین سکتا ہے۔ میں اس پر یلغار کرنے والا ہوں۔‘‘ (ابن سید الناس الیعمری، عیون الاثر ۳۳۹/۲)

اسی طرح قیصر نے کہہ دیا تھا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مانی تو اس کا پایۂ تخت ایک دن ان کے قدموں تلے ہوگا:

یا معشر الروم هل لكم في الفلاح والرشد وأن يثبت ملككم فتبايعوا هذا النبي؟ (بخاری، رقم ۷)	’’اے جماعت روم، کیا تم اس بات کی خواہش رکھتے ہو کہ تمھیں کامیابی اور ہدایت نصیب ہو اور تمھاری سلطنت قائم رہے اور تم اس نبی کی پیروی قبول کر لو؟‘‘

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مولانا عمار خان ناصر لکھتے ہیں کہ

’’امام ابوعبید کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خط میں قیصر کو اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں جزیہ ادا کرنے کا حکم بھی دیا۔ آپ نے فرمایا:

انی ادعوك الی الاسلام فان اسلمت فلك ما للمسلمین وعلیك ما علیهم فان لم تدخل فی الاسلام فاعط الجزیة فان اللّٰه تبارك وتعالی یقول: قاتلوا الذین ..... حتی یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون والا فلا تحل بین الفلاحین وبین الاسلام ان یدخلوا فیه او یعطوا الجزیة.

(الاموال ۹۳)

’’میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر اسلام لے آؤ گے تو تمھارے حقوق و فرائض وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں اور اگر اسلام میں داخل نہ ہونا چاہو تو پھر جزیہ ادا کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اہل کتاب سے قتال کرو.... یہاں تک کہ وہ زیر دست ہو کر پستی کی حالت میں جزیہ ادا کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو پھر اس بات میں رکاوٹ نہ ڈالو کہ اہل روم اسلام میں داخل ہو جائیں یا جزیہ ادا کریں۔‘‘‘(۷۰)

یہی وجہ ہے کہ ایران کے کسریٰ نے بھی اسے ہلکا نہ لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ چنانچہ ایسا نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف خط لکھنے سے اتمام حجت ہو گیا تھا، سارا معاملہ ان کے سامنے تھا۔

دوسری بات یہ کہ صحابہ نے ان کے سامنے شرائط بھی وہی رکھیں تھیں جو جزیرۂ عرب کے اہل کتاب کے سامنے رکھی گئی تھیں اور سزا بھی وہی تجویز کی جو جزیرۂ عرب کے اہل کتاب پر نافذ کی گئی تھی۔ اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی اصول کی روشنی میں طے ہوا جس اصول کے تحت عرب کے اہل کتاب، جن پر اتمام حجت ہوا تھا، سے معاملہ کیا گیا تھا۔

یہ صحابہ کا اجتہادی فیصلہ تھا کہ انھوں نے جزیرۂ عرب میں ہونے والے اتمام حجت کے معاملے کو روم و ایران تک پھیلا دیا۔ تاہم، اس سلسلے میں ان کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے فتح و نصرت کی بشارتیں بھی موجود تھیں، جن سے ان کے اجتہاد کو تقویت ملی ہوگی۔

صحابہ کی ان جنگوں کی سیاسی اور سماجی تاویلات اور تشریحات بھی کی گئی ہیں، لیکن ہم ان جنگ کے فریق صحابہ کے اپنے بیانات کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں جو ان جنگوں کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بیان کر رہے ہیں۔ یہی ہمارے لیے حجت و دلیل بن سکتا ہے نہ کہ ہماری یا کسی اور کی تاویل۔ مولانا عمار خان ناصر صاحب اپنی کتاب ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''سیدنا ابوبکر نے اہل روم کے خلاف جہاد میں شرکت کی ترغیب دینے کے لیے اہل یمن کو خط لکھا تو اس میں فرمایا:

ان اللّٰہ کتب علی المومنین الجھاد وامرھم ان ینفروا خفافا وثقالا .... ولا یترك اھل عداوته حتی یدینوا الحق ویقروا بحکم الکتاب او یودوا الجزیة عن ید وھم صاغرون.

(ازدی، فتوح الشام ۵، ۶)

''اللہ نے اہل ایمان پر جہاد فرض کیا ہے اور انھیں حکم دیا ہے کہ ہلکے ہوں یا بھاری، جہاد کے لیے نکلیں۔ اس دین کے دشمنوں کو اس وقت تک نہیں چھوڑا جا سکتا جب تک کہ وہ اس دین کی پیروی اختیار کر کے کتاب اللہ کے حکم پر راضی نہ ہو جائیں یا پھر مطیع بن کر ذلت اور پستی کی حالت میں جزیہ ادا کرنا قبول نہ کر لیں۔'''' (۷۵)

''مسلمانوں کے لشکر نے ابوعبیدہ بن جراح کی قیادت میں شام کے علاقے اُردن کا محاصرہ کیا تو اہل روم کے ساتھ گفت و شنید کے دوران میں ان کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ وہ بلقاء اور اُردن کا کچھ علاقہ اس شرط پر مسلمانوں کو دے دیتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ صلح کر لیں اور شام کے باقی علاقوں کو رومیوں سے چھیننے کی کوشش نہ کریں۔ اس کے جواب میں ابوعبیدہ نے ان سے کہا:

امرنا صلی اللّٰہ علیه وسلم فقال اذا اتیتم المشرکین فادعوھم الی الایمان باللّٰہ وبرسوله

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وبالاقرار بما جاء من عند اللّٰہ عز وجل فمن آمن وصدق فھو اخوکم فی دینکم لہ ما لکم وعلیہ ما علیکم ومن ابی فاعرضوا علیہ الجزیۃ حتی یودونھا عن ید وھم صاغرون فان ابوا ان یومنوا او یودوا الجزیۃ فاقتلوھم وقاتلوھم. (ازدی، فتوح الشام ۱۰۹)

''ہمیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ جب تم مشرکین کے پاس جاؤ تو انھیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے اور جو کچھ اللہ کا رسول اللہ کی طرف سے لے کر آیا ہے، اس کا اقرار کرنے کی دعوت دو۔ پھر جو ایمان لے آئے اور تصدیق کر دے، وہ دین میں تمھارا بھائی ہے۔ اس کے حقوق وفرائض وہی ہیں جو تمھارے ہیں۔ اور جو انکار کرے تو اسے جزیہ ادا کرنے کے لیے کہو یہاں تک کہ وہ مطیع بن کر ذلت کی حالت میں جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔ پھر اگر وہ ایمان لانے اور جزیہ دینے سے انکار کریں تو انھیں قتل کرو اور ان کے خلاف جنگ کرو۔''

عمرو بن العاص نے شاہِ مصر مقوقس کے نمائندوں سے کہا:

ان اللّٰہ عز وجل بعث محمدا صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالحق وامرہ بہ وامرنا بہ محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وادی الینا کل الذی امر بہ ثم مضی صلوات اللّٰہ علیہ ورحمتہ وقد قضی الذی علیہ وترکنا علی الواضحۃ وکان مما امرنا بہ الاعذار الی الناسفنحن ندعوکم الی الاسلام فمن اجابنا الیہ فمثلنا ومن لم یجبنا عرضنا علیہ الجزیۃ وبذلنا لہ المنعۃ.

(طبری، تاریخ الامم والملوک ۴/۱۰۷)

''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق دے کر بھیجا اور ان کو اس کی پیروی پر مامور کیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے تمام حکم ہم تک پہنچا دیے اور ہمیں ان کی پیروی کی تلقین کی۔ پھر آپ اپنی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد اللہ کے حضور تشریف لے گئے اور ہمیں ایک نہایت روشن راستے پر چھوڑ گئے۔ انھوں نے ہمیں جو حکم دیے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگوں پر اس طرح حجت قائم کر دیں کہ ان کے پاس عذر باقی نہ رہے۔ پس اب ہم تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ جو اسے قبول کر لے گا، وہ ہمارا شریک بن جائے گا اور جو انکار کرے گا، ہم اسے یہ پیش کش کریں گے کہ وہ جزیہ ادا کرے اور (بدلے میں) اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہوگی۔''' (۸۲)

صحابہ نے یہ معاملہ اگر اتمام حجت کی رو سے نہیں کیا، تو کیا وجہ تھی کہ انھوں نے روم وایران کے سپہ سالاروں کی طرف سے کسی صلح کی پیش کش کو قبول نہیں کیا، حالاں کہ طاقت کے اعتبار سے صحابہ اپنے مقابل سے کمزور تھے، اور قرآن کا حکم بھی ان کے سامنے تھا کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہو تو صلح کر لو:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا وَ تَوَکَّلْ ''یہ لوگ اگر صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اِس کے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عَلَی اللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ. لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسا رکھو۔ بے شک، وہ سننے والا، جاننے والا ہے۔'' (الانفال ۸: ۶۱)

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ جنگیں صحابہ نے تب تک جاری رکھیں جب تک وہ ان سرحدوں تک نہ پہنچ گئے جن تک پہنچنے کی بشارت ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ملی تھیں جو حضرت عمر کے دور خلافت میں فتح ہو گئی تھیں۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دشمن کو مغلوب کر لینے اور ان سے زیادہ طاقت ور ہو جانے کے بعد اور ان کی طرف سے سازشوں اور شورشوں کے خطرے کے باوجود وہ ان مخصوص سرحدوں سے آگے بڑھنے کے لیے تیار نہ ہو رہے تھے اور وہ مقابلے کی بہتر پوزیشن میں بھی تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے اپنے آخری دور کی جنگیں بہ امر مجبوری لڑیں تاکہ دشمن کی کمر توڑی جا سکے اور وہ حملے کرنے بند کر دے۔ مولانا عمار خان ناصر ''جہاد: ایک مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''قادسیہ، مدائن اور جلولاء کے معرکوں کے بعد ۱۶ ہجری میں جنوبی عراق کا علاقہ، جس کو عرب مورخین 'سواد' کے نام سے یاد کرتے ہیں، مسلمانوں کے قبضے میں آ چکا تھا۔ سعد بن ابی وقاص نے مزید پیش قدمی کی اجازت چاہی تو سیدنا عمر نے انھیں اس سے روک دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

وکتبوا الی عمر بفتح جلولاء وبنزول القعقاع حلوان واستاذنوہ فی اتباعھم فابی وقال لوددت ان بین السواد وبین الجبل سدا لا یخلصون الینا ولا نخلص الیھم حسبنا من الریف السواد انی آثرت سلامۃ المسلمین علی الانفال. (تاریخ الامم والملوک ۴/۲۸)

''انہوں نے سیدنا عمر کو خط لکھ کر جلولاء کے فتح ہونے کی خبر دی اور بتایا کہ قعقاع حلوان کے مقام پر مقیم ہیں۔ نیز انہوں نے دشمن کا پیچھا کرنے کی اجازت مانگی لیکن سیدنا عمر نے انکار کر دیا اور کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ سواد اور جبل کے علاقے کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ کھڑی ہو جائے جس کو عبور کر کے نہ وہ ہماری طرف آ سکیں اور نہ ہم ان کی طرف جا سکیں۔ ان شاداب خطوں میں سے ہمارے لیے سواد ہی کافی ہے۔ مجھے مال غنیمت کے مقابلے میں مسلمانوں کی سلامتی زیادہ عزیز ہے۔'''' (۱۱۸)

''طبری لکھتے ہیں:

وقد قال عمر حسبنا لاھل البصرۃ سوادھم والاھواز وددت ان بیننا وبین فارس جبلا من نار لایصلون الینا منہ ولا نصل الیھم کما قال لاھل الکوفۃ وددت ان بینھم وبین الجبل جبلا من نار لایصلون الینا منہ ولا نصل الیھم. (تاریخ الامم والملوک ۴/۷۹)

''سیدنا عمر نے کہا: ہم اہل بصرہ کے لیے سواد اور اہواز کا علاقہ کافی ہے۔ کاش ہمارے اور فارس کے علاقے کے

درمیان آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ ہم تک پہنچ پاتے اور نہ ہم ان تک پہنچ پاتے۔ اسی طرح آپ نے اہل کوفہ کے بارے میں کہا تھا کہ کاش ان کے اور جبل کے علاقے کے مابین آگ کا کوئی پہاڑ ہوتا۔ نہ وہ اس طرف آ سکتے اور نہ ہم ادھر جا سکتے۔''' (۱۲۱)

''فارس کے علاقے میں عام لشکر کشی کی اجازت سیدنا عمر نے ۱۷ ہجری میں احنف بن قیس کی تجویز پر دی۔

یا امیر المومنین اخبرك انك نهیتنا عن الانسیاح فی البلاد وامرتنا بالاقتصار علی ما فی ایدینا وان ملك فارس حی بین اظهرهم وانهم لا یزالون یساجلوننا ما دام ملكهم فیهم ولم یجتمع ملكان فاتفقا حتی یخرج احدهما صاحبه وقد رایت انا لم ناخذ شیئا بعد شئ الا بانبعاثهم وان ملكهم هو الذی یبعثهم ولا یزال هذا دابهم حتی تاذن لنا فلنسح فی بلادهم حتی نزیله عن فارس ونخرجه من مملكته وعز امته فهنالك ینقطع رجاء اهل فارس ویضربون جاشا.

(طبری، تاریخ الامم والملوک ۸۹/۴)

''اے امیر المومنین! میں آپ کو اصل بات بتاتا ہوں۔ آپ نے ہمیں مملکت فارس میں دور تک گھسنے سے منع کر رکھا ہے اور ان علاقوں پر اکتفا کرنے کا حکم دیا ہے جو ہمارے قبضے میں ہیں، جبکہ اہل فارس کا بادشاہ زندہ سلامت ان کے مابین موجود ہے اور جب تک وہ رہے گا، اہل فارس ہمارے ساتھ آمادۂ پیکار رہیں گے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ ایک سرزمین میں دو بادشاہ اتفاق سے رہیں۔ ان میں سے ایک کو لازماً دوسرے کو نکالنا پڑے گا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمیں اہل فارس کی بغاوتوں ہی کے نتیجے میں ایک کے بعد دوسرے علاقے پر قبضہ کرنا پڑا ہے اور ان تمام بغاوتوں کا سرچشمہ ان کا بادشاہ ہے۔ ان کا وتیرہ یہی رہے گا جب تک کہ آپ ہمیں اجازت نہیں دیتے کہ ہم ان کی مملکت میں گھس کر ان کے بادشاہ کو وہاں سے ہٹا دیں اور اس کی سلطنت اور سربلندی کی جگہ سے اس کو نکال دیں۔ اس صورت میں اہل فارس کی امیدیں ٹوٹ جائیں گی اور وہ پرسکون ہو جائیں گے۔''' (۱۲۳)

اسی طرح حضرت عمر ممکنہ شورشوں اور بغاوتوں کے باوجود مصر، افریقہ اور ہندوستان پر حملہ آور ہونے سے گریزاں رہے۔ نیز ترکوں اور اہل حبشہ سے بھی جنگ کرنے سے اجتناب برتتے رہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لڑنے میں پہل کرنے سے منع فرمایا تھا۔ مولانا عمار خان ناصر لکھتے ہیں:

''مذکورہ پالیسی کی پابندی کے معاملے میں سب سے زیادہ سخت اور بے لچک رویہ سیدنا عمر کا تھا اور ان کی نسبت سے اس کی معنویت اس تناظر میں بالخصوص دوچند ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض پیش گوئیوں کی بنا پر وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ ان کی وفات سے مسلمانوں کی قوت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ان کی قوت وشدت اندر کا رخ کر کے مسلمانوں کے باہمی قتل وقتال کی شکل اختیار کر لے گی۔ ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

والله لا يفتح بعدی بلد فيكون فيه كبير نيل بل عسى ان يكون كلا على المسلمين.

(ابو یوسف، الخراج، ص ۲۶)

''بخدا، میرے بعد کوئی علاقہ ایسا فتح نہیں ہوگا جس سے مسلمانوں کو کوئی بڑا فائدہ حاصل ہو، بلکہ الٹا اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے بوجھ بن جائے۔''

...رومی اور فارسی سلطنتوں کے خلاف جنگ کی اجازت حاصل ہونے کے باوجود وہ ان کے تمام علاقوں پر قبضہ نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ان کے پیش نظر اصلاً صرف شام اور عراق کے علاقے تھے اور وہ ان سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے تھے۔'' (۱۳۶)

اس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں خود کو حق بجانب محسوس کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے وقت تک وہ تمام علاقے مسلمانوں کے زیر نگیں آ گئے تھے، جہاں اتمام حجت کے نتیجے میں محکومی کی سزا کا نفاذ اللہ اور رسول کا منشا تھا۔ اس کے بعد جو علاقے فتح ہوئے، وہ سیاسی معاملات ہیں، ان کا اتمام حجت سے کوئی تعلق نہیں۔ اتمام حجت وہاں تک کارفرما تھا جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں آپ کا پیغام اور سرگذشت اتمام حجت پوری وضاحت اور براہین کی اطلاع کے ساتھ پہنچ گئے تھے، اور آپ نے ان علاقوں کے سربراہوں کو خطوط لکھ کر انھیں براہ راست مخاطب بنا کر معاملہ اور بھی واضح کر دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قانون اتمام حجت اور ارتداد کی سزا

ارتداد کی سزا کو بھی قانون اتمام حجت کے تناظر ہی میں سمجھا جانا چاہیے۔ ارتداد کی سزا کا تعلق عقیدے سے ہے، اور عقیدہ دل کا معاملہ ہے اور دل کی حالت پر اطلاع خدا کے سوا کسی کو نہیں اور خدا کی طرف سے اس دنیا میں اس کی اطلاع پانا رسول کے علاوہ کسی اور کے لیے ممکن نہیں ہے۔ عہد رسالت میں کفر وشرک کو خدا کی طرف سے اس دنیا میں اس لیے سزا ملی تھی کہ رسول کے ذریعے سے ان پر اتمام حجت ہوا تھا اور سزا یافتہ قوم کے پاس انکار کا کوئی عذر نہیں رہ گیا تھا، بعینہٖ یہی معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان مرتدین پر بھی لاگو ہوا تھا جو رسول کے اتمام حجت کے بعد، ایمان لا کر دوبارہ کفر وشرک کا ارتکاب کر بیٹھے تھے، چنانچہ انھیں بھی کفر وشرک کی وہی سزا ملی جو اس وقت کے کفار ومشرکین کے لیے مقرر کی گئی تھی، یعنی موت۔ جس طرح عہد رسالت کے بعد کفر وشرک پر قتل ومحکومی کی سزا کا

اطلاق اور تعمیم درست نہیں، اسی طرح ارتداد پر بھی اس سزا کا عمومی نفاذ درست نہ ہوگا۔ رسول اللہ کا ارشاد 'مَنۡ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقۡتُلُوهُ' (جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو) بھی اسی تناظر میں درست معلوم ہوتا ہے۔

جس طرح آج یہ طے نہیں ہو سکتا کہ کس غیر مسلم پر اتمام حجت ہو گیا ہے یا نہیں، کون جان بوجھ کر منکر ہے اور کون ناسمجھی کی وجہ سے انکار کر رہا ہے، اسی طرح یہ معلوم کرنے کا بھی کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ مرتد ہونے والے کے پاس اسلام چھوڑ دینے کا کوئی عذر محض بہانہ ہے یا وہ واقعی اسے کوئی عقلی تقاضا سمجھ رہا ہے۔

موت کو ارتداد کی عام سزا قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرتد اگر موت کی سزا کے ڈر سے بظاہر مسلمان بن کر رہنے لگے تو قانون و معاشرہ اسے قبول کر لے، لیکن اگر دیانت داری سے اپنے منحرف عقیدے کا اظہار کر دے تو قتل کی سزا کا مستحق قرار پائے، یعنی منافق مسلم قبول ہوگا اور کھلم کھلا منکر ناقابلِ قبول۔ ایک منافق مسلم ایک مسلم سماج کے لیے زیادہ نقصان دہ ہو سکتا ہے یا ایک علانیہ غیر مسلم؟ عقیدہ دل کا معاملہ ہے، اس پر کوئی قانونی پابندی لگانا عقل و فہم کی رو سے بھی کوئی معقول بات معلوم نہیں ہوتی۔ آج کے مرتدین یا متشککین سے صرف مکالمہ ہی ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر دور جدید کے فلسفوں اور اہل مذہب کی طرف سے مذہب کے نام پر شدید بداخلاقی، انتہا پسندانہ رویوں اور الحادی افکار کے شافی جوابات دینے کی قابلیت کے فقدان کی وجہ سے یہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ بہت سے لوگوں کے لیے دین کا تعارف ایسے ہی لوگ بن گئے ہیں اور دین سے ان کی روگردانی کا سبب بھی۔ ایسے میں مذہب بے زار طبقے کو مرتد قرار دے کر ان کی موت کے فتاویٰ صادر کرنا نہ تو دین کا تقاضا ہے اور نہ دین کی کوئی خدمت، بلکہ دین کے نام پر مزید خرابی پیدا کرنے کا سبب ہے۔ البتہ ارتداد کو اگر منفی انداز کا پراپیگنڈا بنا لیا جائے یا دین کے معاملے میں تضحیک اور تحقیر کے رویے اپنا لیے جائیں تو اس صورت میں یہ معاملہ فساد فی الارض کے زمرے میں دیکھا جا سکتا ہے اور ایک مسلم حکومت اس کو اسی جرم کے تناظر میں برت سکتی ہے۔

یہاں یہ بھی واضح ہو جانا چاہیے کہ مذکورہ بالا حدیث رسول کے الفاظ (مَنۡ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقۡتُلُوهُ، جو اپنا دین بدلے اسے قتل کر دو) میں 'مَنۡ'، یعنی 'جو' کے لفظ کے لفظاً مطلق ہونے سے غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، یعنی یہ سمجھنا کہ قیامت تک جو بھی شخص اسلام سے منحرف ہو، وہ اس سزا کا مصداق ہے، محض زبان کے عام اور معروف فہم کی بنا پر بھی درست نہیں ہے۔ منطقیانہ اصولی مباحث سے قطع نظر، اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو کلام جب بھی صادر ہوتا ہے تو چاہے وہ مطلق ہی کیوں نہ ہو، اپنے عقلی مقیدات مضمر طور پر ساتھ رکھتا ہے جو بدیہی طور پر سمجھ آ جاتے ہیں۔ مثلاً اگر میں اپنے طلبہ سے یہ کہوں کہ جو طالب علم کل کلاس میں نہیں آئے گا، اسے جرمانہ ہوگا، لیکن ایک طالب علم کو کوئی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حادثہ پیش آ جاتا ہے تو کیا یہ جرمانہ اس پر بھی لاگو ہوگا؟ یقیناً نہیں۔ لیکن یہ استثنا کیسے سمجھا گیا، جب کہ الفاظ میں کوئی استثنا نہیں؟ اسی طرح اس جملے میں ''جو طالب علم'' سے مراد صرف اس کلاس کے طلبہ مراد لینے میں بھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی، یعنی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں ساری دنیا کے قیامت تک کے طلبہ مراد لیے جا سکتے ہیں، حالاں کہ الفاظ یہاں بھی عام ہیں۔ یہ کس بنا پر سمجھا گیا؟ زبان کے معروف فہم کے مطابق۔ گویا کلام محض منطقی اصولوں سے نہیں انسانی زبان کے معروف اسالیب اور فہم کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتدین کے قتل کا یہ حکم دیا تو آپ کے سامنے وہ لوگ موجود تھے جن پر آپ نے اتمام حجت کر دیا تھا اور ان کی موت کا اعلان خدا کر چکا تھا۔ چنانچہ مطلق ہونے کے باوجود آپ کے الفاظ تخصیص کے حامل سمجھے جائیں گے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ ارتداد پر موت کی سزا کا یہ حکم ابدی تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک عام قانون کا بیان فرما رہے تھے، زبان کے عام اور معروف فہم اور اسلام کے بنیادی اصول 'لا إكراه في الدين' (دین میں کوئی جبر نہیں) کے خلاف ہوگا۔

مولانا مودودی نے ارتداد کے مسئلے کو بھی دین کے بارے میں اپنے خاص نقطۂ نظر، یعنی حاکمیت اسلام کے تناظر میں دیکھا ہے۔ آپ نے دین کو ریاست کے مترادف قرار دے کر ارتداد کو دین سے بغاوت اور سرکشی قرار دیا ہے کہ چونکہ بغاوت کی سزا ریاست کے قانون کے لحاظ سے بھی موت ہوتی ہے، اس لیے اسلام میں ارتداد کی سزا کا موت ہونا درست ہے۔

اس پر عرض ہے کہ ارتداد کو بغاوت سمجھنا ہی غلط ہے۔ ہم ریاست کی مثال ہی لیتے ہیں۔ ایک شخص اگر ریاست کے خلاف کھڑا ہو جائے تو یہ بغاوت ہے، لیکن اگر وہ اپنا ملک چھوڑ کر چلا جائے، مزید یہ کہ اپنی شہریت بھی ترک کر دے تو اسے باغی نہیں کہا جاتا۔ چنانچہ کوئی شخص اگر اسلام ترک کر دیتا ہے تو اس کو بغاوت نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم، ارتداد اگر اسلام کے خلاف منفی پراپیگنڈا، تضحیک و تحقیر کا ذریعہ بنا لیا گیا ہو تو وہ الگ جرم ہے۔ اسے فساد شمار کیا جا سکتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ مرتد ہونے والا دوسرے مسلمانوں کے لیے ارتداد کی دعوت بن جاتا ہے، اس لیے اس کا قتل کرنا درست ہے تو یہ بات بھی سماجی رویوں کے مطابق درست نہیں۔ کوئی مرتد اگر موت کے ڈر سے بھی اپنے ارتداد سے نہ پھرے، اپنے مزعومہ عقیدے یا نظریے پر جان دے دے، تو یہ الٹا اس کی استقامت کی دلیل بن جائے گی اور یہ دوسروں کے لیے اور بھی متاثر کن ہوگی۔

قانون اتمام حجت کی تعمیم کیوں نہیں ہو سکتی؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح صحابہ نے اتمامِ حجت کے قانون کو جزیرۂ عرب سے باہر روم و ایران پر لاگو کیا،

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کیا ان کے بعد آنے والے عام مسلمانوں یا خود بنی اسمٰعیل کے لیے بھی اس قانون پر عمل کرتے ہوئے غیر مسلم ریاستوں کے خلاف اقدامی جنگ کوئی مذہبی فریضہ یا داعیہ قرار پاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اتمام حجت اپنی نوعیت میں خاص ہے، کیونکہ اس کے لیے رسول کی موجودگی میں اتمام حجت ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اس قانون پر مرتب ہونے والے احکام بھی خاص تھے اور ان کا اطلاق بھی خاص تھا۔ ان کی عمومیت کی کوئی دلیل موجود نہیں، اس لیے اس قانون کی تعمیم نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر عام مسلمان، بلکہ بنی اسمٰعیل بھی دین کے نام پر کسی دوسری ریاست کے خلاف اقدامی جہاد نہیں کر سکتے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ہمارے لیے نمونۂ عمل کی ہے، یعنی دین کے وہ احکام جن کی نوعیت ابدی تھی، اس میں آپ کی سنت اور سیرت ہمارے لیے نمونۂ عمل ہیں۔ لیکن آپ کے ساتھ جو حالات بیتے، خدا نے جس طرح آپ کی خاص مدد فرمائی اور اپنے قانون کے مطابق غلبہ دیا، وہ ہمارے لیے سرگذشت کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کا مقصد تذکیر اور انذار ہے، بالکل ایسے ہی جیسے دیگر رسولوں کی سرگذشت ہم قرآن میں پڑھتے ہیں، لیکن بعینہٖ اس پر عمل نہیں کر سکتے، لیکن اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔

اس بات کو یوں سمجھیے کہ جس طرح آپ کسی بڑی شخصیت کی سوانح کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کو اس میں اپنی زندگی کے لیے رہنمائی اور بصیرت تو مل رہی ہوتی ہے، لیکن ان تمام باتوں پر بعینہٖ عمل کرنا نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگذشت ہے۔ اس سرگذشت میں وہ ہدایات جو پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کو اپنے خاص حالات کے تحت ملیں، ان کا مقصد ہمارے لیے تنبیہ، تذکیر اور خدا کی نشانیوں کا سامان مہیا کرنا ہے، مثلاً کسی رسول اور اس کے ساتھیوں کی سرگذشت میں بیان کردہ حالات جیسے حالات پیش آ جائیں تو ہمیں ان جیسا رویہ اور عمل اپنانا چاہیے، ان سرگذشتوں سے عمومی احکامات کا صدور نہیں ہو رہا ہوتا۔ ہمیں ایک داستان سنائی گئی ہے، کوئی ضابطۂ عمل بیان نہیں کیا گیا۔

احکامات کی عمومیت اور خصوصیت ان کے سبب یا علت کے عام یا خاص ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً ایمان کی دعوت قبول کرنا اور خدا کی عبادت کے احکام اپنی نوعیت میں عمومیت کے حامل ہیں، کیونکہ خدا نے جن و انس کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے۔ لیکن اتمام حجت کا قانون اور اس پر متفرع ہونے والے احکام کی تعمیم نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس کا سبب یا علت، یعنی رسول کی موجودگی میں اتمام حجت، خاص ہے، عام نہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عہد رسالت کے بعد انکارِ حق پر قائم منکر اقوام پر کوئی دنیوی عذاب

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نازل نہیں ہوا۔ ان پر بھی زوال اگر آیا ہے تو ویسے ہی جیسے کسی بھی قوم پر زوال کے عام اسباب کی بنا پر آتا ہے۔ آج کی بعض منکرین حق اقوام کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے علم و عقل کی بنیاد پر ترقی اور خوش حالی کی منزلوں پر منزلیں طے کرتی جاتی ہیں، اسی طرح، اب مومنین کے لیے بھی فتح و نصرت کے وعدے بھی اسی ضمانت، تیقن اور قوت کے ساتھ پورے نہیں ہوتے، جیسا کہ وہ صحابہ کے لیے پورے ہوئے تھے، مثلاً صحابہ سے کیے جانے والے یہ وعدے دیکھیے:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ. (آل عمران ۳: ۱۳۹)

''اور (جو نقصان تمھیں پہنچا ہے، اُس سے) بے حوصلہ نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو غلبہ بالآخر تمھیں ہی حاصل ہوگا۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ. (محمد ۴۷: ۷)

''ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمھاری مدد کرے گا اور (ان دشمنوں کے مقابلے میں) تمھارے پاؤں جما دے گا۔''

ہم جانتے ہیں کہ مسلم تاریخ میں بہت سی مسلم عسکری تحریکیں اٹھیں، لیکن وہ سب شکست و ناکامی سے دو چار ہوئیں۔ ان میں سے ہر تحریک، قرآن مجید میں بیان کردہ صحابہ کو دی جانے والی فتح و نصرت کی بشارتوں کو اپنے لیے بھی باور کرتی رہی، لیکن ان کو کامیابی نہیں ملی۔ ان میں سے بہت سی ایسی تحریکیں تھیں، جن کے اخلاص، تقویٰ، للّٰہیت اور قربانیوں پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، اس کے باوجود وہ ناکام ہوئیں۔ یہ سب یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ سرگذشتوں کا مطلب یہ نہیں تھا کہ قانونِ اتمامِ حجت اور اس کے تناظر میں فتح و نصرت اور عذاب و عقاب کے وعدے اور وعیدیں قیامت تک کے مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے لیے کوئی ضابطہ قرار پائے ہیں۔ قرآنی نصوص کا درست فہم اور تاریخی حقائق سب اس غلط فہمی کے ابطال میں ناقابل تردید برہان کی صورت میں ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔

قانون اتمام حجت کو تسلیم نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اگر یہ سب ایسا نہیں، جیسا کہ قانون اتمام حجت کی روشنی میں ہم نے بیان کیا ہے تو قرآن مجید کے بہت سے احکامات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی سیاسی اور جنگی حکمت عملی پر بہت سے سوال کھڑے ہو جاتے ہیں جن کا کوئی شافی جواب دینا ممکن نظر نہیں آتا۔ مثلاً:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

i۔ تمام رسولوں کے منکرین اسی دنیا میں ختم کر دیے گئے۔ اس استیصال کو خدا نے اپنی سنت کہا ہے، اور کہا ہے کہ خدا کی یہ سنت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ پھر پورے قرآن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کو اسی دنیوی عذاب سے بار بار ڈرایا گیا۔ پھر صحابہ سے کہا گیا کہ وہ عذاب تمھارے ہاتھوں سے نازل ہوگا۔ اب اگر صحابہ کی تلواروں سے آنے والا عذاب وہ عذاب نہیں تھا جو رسولوں کے منکرین پر اسی دنیا میں آتا تھا تو بتایا جائے کہ خدا کی یہ غیر متبدل سنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منکرین کے حق میں کیسے بدل گئی، وہ دنیوی عذاب ان منکرین پر کیوں نہ آیا؟

ii۔ اگر صحابہ کی تلواروں سے آنے والا عذاب وہی عذاب تھا جو رسولوں کے براہ راست منکرین حق پر آتا تھا تو یہ عذاب خاص سنن الٰہیہ میں سے تھا، تو جس طرح گذشتہ دنیوی عذاب اپنے زمان و مکان کے ساتھ مخصوص تھے، یہ عذاب بھی اپنے مکان و زمان کے ساتھ مخصوص ہونا چاہیے۔ لیکن اس عذاب کو بیان شریعت کس بنیاد پر سمجھ لیا گیا اور اس کی تعمیم کس دلیل سے کی گئی؟

iii۔ صحابہ کس بنیاد پر عرب کے مشرکین کو اسلام اور تلوار کے علاوہ کوئی اور انتخاب نہیں دیتے تھے، جب کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں۔ جو ایمان لانا چاہے، لائے، جو کافر ہونا چاہے ہو جائے۔ ان کا حساب آخرت میں کیا جائے گا:

وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكُمۡ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ اِنَّاۤ اَعۡتَدۡنَا لِلظّٰلِمِيۡنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمۡ سُرَادِقُهَا وَاِنۡ يَّسۡتَغِيۡثُوۡا يُغَاثُوۡا بِمَآءٍ كَالۡمُهۡلِ يَشۡوِى الۡوُجُوۡهَ بِئۡسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتۡ مُرۡتَفَقًا. (الکہف ۱۸: ۲۹)

''اِن سے کہو، تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے۔ سو جس کا جی چاہے، ایمان لائے اور جس کا جی چاہے، انکار کر دے۔ ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کے سرا پردے اُن کو اپنے گھیرے میں لے لیں گے۔ اگر وہ پانی کے لیے فریاد کریں گے تو اُن کی فریاد رسی اُس پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تانبے کی طرح ہوگا۔ وہ چہروں کو بھون ڈالے گا۔ کیا ہی برا پانی ہوگا اور کیا ہی برا ٹھکانا!''

iv۔ کیا وجہ ہے کہ اہل کتاب کو تو جارحیت سے باز آ جانے پر محکومی کے ساتھ جزیرۂ عرب میں رہنے کی اجازت دے دی گئی، لیکن مشرکین عرب کو یہ انتخاب نہیں دیا گیا، ان کے لیے جزیرۂ عرب میں رہنے کی صورت میں تلوار یا اسلام کے علاوہ تیسرا انتخاب کیوں نہ تھا؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

v۔ کیا وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتا ہے کہ آپ کو ان منکرین پر داروغہ نہیں بنایا گیا کہ ان سے منوا کر ہی چھوڑیں اور دوسری طرف کہتا ہے کہ ان کفار سے اس وقت تک برابر قتال کیے جاؤ جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور نماز قائم کر کے اور زکوۃ ادا کر کے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت نہ دے دیں؟

vi۔ کیا وجہ تھی کہ صحابہ اس وقت بھی جنگ سے واپس نہ ہوئے جب رومی و ایرانی سرداروں نے انھیں صلح کی پیش کش کی؟ جب کہ قرآن کہتا ہے کہ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو ان سے صلح کر لو۔

vii۔ اگر صحابہ کی جنگ کشور کشائی یا مخالف جارح طاقتوں کی بیخ کنی کے لیے تھی تو وہ اس وقت جنگ سے کیوں رکنا چاہ رہے تھے جب جنگی تقاضوں اور جارحیت کے خاتمے کے لیے جنگ جاری رکھنا ضروری تھا، اس وقت وہ مخصوص سرحدوں تک محدود کیوں رہنا چاہ رہے تھے؟

viii۔ اگر صحابہ نے روم و ایران پر جنگی مہمات اتمامِ حجت کے قانون کے تحت نہیں کیں تو روم و ایران کے محکوموں پر وہی سزا کیوں نافذ کی گئی جو عرب کے اہل کتاب پر نافذ کی گئی؟

ix۔ قرآن مجید ایک جگہ کہتا ہے کہ کفار اگر صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کر لو، اور دوسری طرف کہتا ہے کہ کفار کے ساتھ تمام معاہدات ختم کر دو، بلکہ جنھوں نے معاہدات کے دوران کوئی خلاف ورزی نہیں کی، ان کے معاہدات کی مدت مکمل کرنے کے بعد ان سے آئندہ کے لیے کوئی معاہدہ بھی نہ کرو، اور پھر ان کے ساتھ بھی قتال کرو؟ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مختلف حالتوں کے احکام ہیں۔ مسلمان اگر کمزور ہوں یا مسلمانوں کی سیاسی مصلحت کا تقاضا ہو تو صلح کر لی جائے، ورنہ اصل قتال ہی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے ساتھ سن ۶ ہجری میں اس وقت صلح کی جب آپ سیاسی اور عسکری لحاظ سے ان سے طاقت ور ہو چکے تھے، اور اسی وجہ سے حضرت عمر سمیت دیگر مسلمانوں کو دب کر صلح کرنا کھل رہا تھا۔

x۔ فقہا نے کس بنا پر یہ ضروری سمجھا ہے کہ دین و ایمان کی دعوت سے پہلے کسی قوم پر جنگ مسلط نہیں کی جا سکتی؟

فقہا نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی عسکری مہمات کے لیے، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے بھی اقدامی جنگوں کا جواز اسی قانون کی تعمیم کی رو سے مہیا کرتے ہیں۔ یعنی جب فقہ میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ صحابہ نے روم و ایران کو پہلے دعوت اسلام دی، جس کے انکار پر ان پر جنگ مسلط کر دی گئی، اور صحابہ نے کفر یا شوکت کفر توڑنے کے لیے یہ اقدام کیا تو درحقیقت یہ اتمام حجت کے قانون ہی کا بیان ہے۔ بلکہ اسی بنیاد پر ایک عام مسلم ریاست کے لیے بھی اقدامی جنگ کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ ابن رشد لکھتے ہیں:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

فَأَمَّا شَرْطُ الْحَرْبِ فَهُوَ بُلُوْغُ الدَّعْوَةِ بِاتِّفَاقٍ، أَعْنِي أَنَّهُ لَا يَجُوْزُ حِرَابَتُهُمْ حَتّٰى يَكُوْنُوْا قَدْ بَلَغَتْهُمُ الدَّعْوَةُ، وَذٰلِكَ شَيْءٌ مُجْمَعٌ عَلَيْهِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ؛ لِقَوْلِهِ تَعَالٰى: (وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا) (الإسراء: ١٥). (بدایۃ المجتہد، ۱۴۹/۲)

''اس پر اتفاق ہے کہ جنگ کی شرط ابلاغِ دعوت ہے۔ یعنی یہ دعوت جب تک ان غیر مسلموں تک پہنچ نہ جائے ان سے جنگ کرنا جائز نہیں۔ اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔''''

قانون اتمام حجت کو بہ نظر غائر نہ دیکھنے کی وجہ سے یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ دین اسلام کی محض خبر پہنچا دینے سے اتمام حجت ہو جاتا ہے اور ایک مسلم ریاست کو غیر مسلموں پر جنگ مسلط کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اس تعبیر کی غیر معقولیت عیاں ہے اور بڑے خلجان کا باعث بھی ہے، لیکن اس ساری صورتِ حال کو ہمارے بیان کردہ قانون اتمام حجت کی روشنی میں سمجھا جائے تو تمام اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے جن دلائل کی بنا پر قانون اتمام حجت بیان کیا ہے، اس کی رو سے ایسے تمام اقدامات کا جواز اور مصداق زمان و مکان کے مخصوص دائرے میں متعین ہو جاتا ہے اور یہ طے ہو جاتا ہے کہ اس قانون سے متعلق احکامات شرعی اور ابدی نوعیت کے نہیں تھے، البتہ اس سے حاصل ہونے والی عبرت عام اور ابدی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حرف آخر

ان معروضات کی روشنی میں قانونِ اتمامِ حجت پر وارد کیے گئے اب تک کے تمام نمایاں اعتراضات اور اشکالات کے جوابات ہمارے فہم کے مطابق بہ خوبی حاصل ہو جاتے ہیں۔ تاہم انسانی علم و فہم خطا سے مبرا نہیں۔ اہل علم سے گزارش ہے کہ راقم کے اس سارے بیان میں جو کمی، کوتاہی یا غلطی پائیں نشان دہی فرما کر ممنون فرمائیں۔ جزاکم اللہ۔